عبادت اور عبودیت

(از افادات شیخ الاسلام ابن تیمیہ رح)

مترجمہ: مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

(۲)

قائلین جبر کی گمراہیاں جو لوگ حقائق تکوینی کا مشاہدہ حاصل کرنے کے بعد اس مشاہدہ کو حقائق دینی اور احکام شرعی کے اتباع سے مانع سمجھتے ہیں، یعنی ارادۂ الٰہی کے علم و مشاہدہ کو تکلیف شرعی کے ساقط ہو جانے کا موجب ٹھیراتے ہیں، وہ ضلالت کے مختلف مراتب پر ہیں

(۱) ان میں جو غالی قسم کے لوگ ہیں ان کے نزدیک تو یہ اصول بالکل عام ہے اور وہ ہر اس امر پر قضا و قدر کا نام لینے لگتے ہیں جو ان سے خلاف شرع سرزد ہوتا ہے۔ ان لوگوں کا یہ اصول اور قول یہود و نصاریٰ کے اقوال ضلالت سے بھی زیادہ بدتر اور ملحدانہ ہے اور ان مشرکین کے اقوال کے مشابہ ہے جو کہا کرتے تھے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم اور ہمارے آباء و اجداد نہ شرک کرتے نہ کسی شے کو اس کے حکم کے خلاف حرام ٹھیراتے (سورۃ انعام رکوع ۱۸)۔ روئے زمین پر ان لوگوں سے بڑھکر تناقض پرست نہیں پایا جا سکتا، اور حقیقت تو یہ ہے کہ جو شخص بھی کسی مسئلہ میں قضا و قدر سے استدلال کرتا ہے، وہ تناقض کی راہ پر ہے، کیونکہ اس کے لیے کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ وہ ہر فرد بشر کو، اس کے ہر طرح کے اعمال پر ایک ہی انجام کا مستحق قرار دے اور اس کے ہر فعل کو یکساں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اگر کوئی اس پر ظلم کرتا ہے، یا کوئی ظالم عام لوگوں پر ظلم کرتا ہے، یا کوئی شخص زمین میں فساد انگیزی کرتا ہے، آمادۂ خونریزی ہوتا ہے، لوگوں کی آبروریزیاں کرتا ہے اور اسی طرح کے دوسرے خطرناک اور غارت گرانہ و وحشیانہ اقدامات پر اتر آتا ہے تو یہی شخص اس ظلم کی مدافعت پر تیار ہو جاتا ہے اور اس ظالم اور مفسد کو ایسی دردناک سزا دینے پر تل جاتا ہے جو دوسرے ظلم پیشہ لوگوں کے لیے بھی عبرت کا سامان بن جائے۔ پس ایسے مواقع پر اس سے کہنا چاہیے کہ اگر قضا و قدر بھی کوئی "حجت" ہے تو پھر تم کیوں کسی شخص کی کسی حرکت پر چیں بجبیں ہوتے ہو، ہر شخص کو، جو کچھ بھی وہ کرنا چاہے، کرنے دو، اور اگر قضا و قدر کو یہاں تم حجت نہیں تسلیم کرتے تو پھر اپنے اصل دعوے کو باطل سمجھ لو

درحقیقت اس قول کے ماننے والے ہر جگہ ایک ہی اصول سے کام نہیں لیتے اور نہ اپنی بات پر جمتے ہیں، بلکہ ان کی نگاہ ہمیشہ اپنی خواہشات نفس کی طرف ہوا کرتی ہے۔ جہاں کہیں نفس کی تمنا برآری ہو رہی ہوتی ہے، وہاں تو اس اصول کو اصول تسلیم کرتے ہیں اور جہاں کہیں نفس پر بار محسوس ہوا، اس کو پس پشت ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے ایک صاحب علم نے کتنی موزوں بات کہی ہے کہ "اطاعت کے موقع پر تو تم قدری ہوتے ہو اور معصیت کے موقع پر جبری، جو مذہب بھی تمھاری خواہش نفس کے موافق دکھائی دیتا ہے جھٹ اسے قبول کر لیتے ہو"۔

(۲) دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اس اصول کو عام نہیں کرتے اور اس کے اطلاق میں عوام و خواص کی تفریق کرتے ہیں۔ انھیں اپنی تحقیق

اور معرفت کا بڑا ادّعا ہے۔ ان کا گمان یہ ہے کہ وہ شخص تو احکام شرعیہ کا مکلف ہے جو اپنے افعال کے متعلق یہ احساس رکھتا ہو کہ وہ خود اسی کے ارادہ اور اختیار کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جن کو یہ نظر آتا ہو کہ ان کے تمام افعال خدا ہی کے پیدا کردہ ہیں، ان میں ان کے اپنے ذاتی ارادہ و اختیار کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ وہ ان کے کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے اندر یعنی ان کے احوال و افعال میں اسی طرح اپنی منشا کے مطابق تصرف کرتا رہتا ہے جس طرح تمام متحرک چیزوں کو وہ حرکت دیا کرتا ہے، تو ایسے لوگ اوامر و نواہی شرع کے پابند و مکلف نہیں۔ یہ لوگ کہا کرتے ہیں تکلیف شرعی اس شخص سے ساقط ہو جاتی ہے جو ارادۂ الٰہی کا مشاہدہ حاصل کرے۔ چنانچہ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ حضرت خضر اسی مقام پر تھے۔

جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے، اس طائفہ کے اقوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ عوام اور خواص میں تفریق کرتے ہیں۔ عوام کو تو مکلف شرع سمجھتے ہیں اور خواص کو نہیں۔ پھر "عوام" اور "خواص" کی مختلف تعریفیں بیان کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ جن لوگوں کو حقائق تکوینی کا مشاہدہ حاصل ہو جائے اور یہ نظر آ جائے کہ بندوں کے تمام افعال کا خالق خدا ہی ہے اور تمام کائنات محض اسی کے ارادہ اور مشیت کی تابع ہے، ان کے سر سے تکلیف شرعی ساقط ہو جاتی ہے، اور کبھی کہتے ہیں کہ جو کوئی اس حقیقت کو صرف جانتا ہے، دیکھتا نہیں اور بن دیکھے اس پر ایمان رکھتا ہے، وہ تو احکام شرع کا مخاطب ہے، اس کے سر سے تکلیف شرعی ساقط نہیں ہوتی، مگر جو شخص اس حقیقت کا شہود حاصل کرلے اور اسے آنکھوں سے دیکھ لے، وہ اوامر دینی کا پابند نہیں رہ جاتا۔

در اصل اس طرح پر یہ لوگ جبر اور اثباتِ قدر کو مانع تکلیف قرار دیتے ہیں اور اس وہم بلکہ خطرناک گمراہی میں ایسے ایسے لوگ گرفتار ہوتے ہیں جن کو تحقیق و معرفت کا مردِ میدان اور توحید کا رمز شناس کہا جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان کا دماغ یہ سوچنے اور سمجھنے سے قاصر رہا کہ بندہ کو اُس امر کا بھی حکم دیا جا سکتا ہے جس کی خلاف ورزی کرنا اس کے لیے ارادۂ الٰہی میں متعین اور مقدر ہو چکا ہو۔ معتزلہ اور ان کے علاوہ دوسرے قدریہ کا ذہن بھی اس راز حقیقت کے ادراک سے عاجز ہو گیا تھا لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ نے ہر کہہ و مہ کے لیے احکام شریعت کی پابندی تو ضروری قرار دی اور کسی کے حق میں بھی سقوط تکلیف کے قائل نہیں ہوئے مگر انھوں نے قضا و قدر، یعنی مشیت عامۂ الٰہی اور خلق افعال عباد کا انکار کر دیا۔ اور ان کے مقابلہ میں ان لوگوں نے قضا و قدر کا تو اقرار کیا مگر تکلیف شرعی کے عموم کا۔ کیونکہ مطلق انکار ان کے لیے کسی طرح ممکن نہ تھا ——— انکار کر دیا اور اُن لوگوں کے سر سے اس کو ساقط ٹھیرا دیا جن کو مشاہدۂ قدر کا مقام نصیب ہو جائے۔ غور کرو تو نظر آئے گا کہ ان کا قول، معتزلہ کے قول سے زیادہ مبنی بر ضلالت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلف میں کوئی بھی اس کا قائل نہ تھا۔

ان لوگوں کے نزدیک امر و نہی شرعی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو حقائق تکوینی کے مشاہدہ سے بے بہرہ ہیں، اور جو اس منزل تک جا پہنچے ہیں ان کو یہ احکام شریعت کی پابندیوں سے ماورا اور حق تعالیٰ کے زمرۂ خواص میں سمجھتے ہیں۔ یہ اکثر اپنے اس قول کی تائید میں آیت کریمہ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (اور اپنے رب کی، "یقین" کے آنے تک بندگی کر) کو پیش کرتے ہیں اور اس کی عجیب و غریب من گھڑت تاویل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "یقین" سے مراد یہی مقامِ شہود اور معرفتِ ارادۂ الٰہی ہے۔ لیکن یہ کھلا ہوا کفر ہے اگرچہ اس قول کے بیشتر قائلین کو اس کے کفر ہونے کا علم اور شعور نہ تھا۔ کیونکہ اسلام کے اصول اور محکمات پر ایک نگاہ ڈالتے ہی ہمیں یہ بدیہی طور پر دکھائی دیتا ہے کہ شریعت کے احکام کی پابندی ہر بندہ پر، جب تک کہ اس کے اندر عقل و تمیز موجود ہو، زندگی کے آخری لمحوں تک ہے۔ اور وہ کسی بندہ سے کبھی، اور کسی حالت میں بھی، ساقط نہیں ہوتی۔ پس جو شخص دین کے اس بدیہی کلیہ کو نہیں جانتا، اسے جتانا چاہیے اور تشریح کے ساتھ اس کو سمجھا دینا

چاہیے، لیکن اگر اس کے باوجود سقوطِ تکلیف شرعیہ کے اعتقاد پر جما رہے تو پھر وہ گردن زدنی ہے اور اسے قتل کر دینا چاہیے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، اس قسم کے ملحدانہ اقوال اور اعتقادات کا قرونِ اولیٰ میں کوئی وجود نہیں تھا، لیکن متاخرین میں یہ اقوال اور خیالات کثرت سے پائے جاتے ہیں، جو خدا اور اس کے رسول سے بغاوت اور معاندت کے ہم معنی ہے اور تکذیب انبیاء کے مرادف۔ اگر ان باتوں کا کہنے اور اعتقاد رکھنے والا اس خطرناک گمراہی سے واقف نہیں ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ یہی رسولؐ خدا اور اولیاء اللہ کا طریقہ ہے تو دراصل اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ نماز اس پر فرض نہیں ہے، اس وجہ سے کہ اس کو وہ روحانی کمالات اور قلبی احوال حاصل ہیں جن کے ہوتے ہوئے اس کو نماز کی کوئی ضرورت نہیں۔ یا یہ کہ شراب اس کے لیے حرام نہیں، اس لیے کہ وہ ان بندگانِ خاص میں سے ہے جنھیں شراب نوشی کوئی روحانی مضرت نہیں پہنچا سکتی۔ یا یہ کہ بدکاری اس کے لیے حلال ہے، اس بنا پر کہ وہ سمندر کی طرح ہو گیا ہے جس کو گناہوں کے خس و خاشاک گدلا نہیں کر سکتے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ وہ مشرکین جنھوں نے اللہ کے پیغمبروں کو جھٹلایا اور ان کا رسول اور مطاع باذن اللہ ہونا تسلیم نہیں کیا وہ فکر کی دو اصولی غلطیوں میں مبتلا تھے۔ ایک تو بدعت، دوسرے استدلال بالقدر۔ وہ کبھی ان بدعتوں کو اپنی مذہبی زندگی کی اساس ٹھیراتے تھے جو شریعت الٰہی کے سراسر خلاف تھیں اور کبھی احکامِ الٰہی کی پابندیاں قبول کرنے کے خلاف قضا و قدر سے استدلال کیا کرتے تھے۔

مشرکین کی یہی خصوصیات کسی نہ کسی رنگ میں اِن لوگوں میں بھی موجود ہیں۔ خواہ یہ خلافِ شرع بدعات کا ارتکاب کریں، خواہ قدر سے استدلال کریں، یا بیک وقت دونوں گمراہیوں کے حامل ہوں، ان مشرکین سے ان کی اعتقادی مشابہت ہر حال اور ہر صورت میں عیاں ہے۔ مشرکین کی ایک خصوصیت یعنی استدلال بالقدر کے متعلق چند آیاتِ قرآنی اوپر گزر چکی ہیں۔ رہی دوسری خصوصیت یعنی ان کی بدعت پرستی، اور شریعت سازی سو اس کا تذکرہ، اور پھر اس کی تردید و تکذیب بھی دوسرے مقامات کے علاوہ سورہ انعام اور اعراف میں بالتفصیل بیان کی گئی ہے:-

وَقَالُوا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ (انعام-۱۶)

اور ان مشرکوں کا کہنا ہے کہ فلاں فلاں مویشی اور کھیت ہیں جو عام استعمال کے لیے ممنوع ہیں۔ ان کو ان لوگوں کے علاوہ کوئی نہیں کھا سکتا جن کو ہم چاہیں۔ اور کہتے ہیں کہ فلاں فلاں جانور ایسے ہیں جن کی پیٹھیں (سواری یا باربرداری کے لیے) حرام کر دی گئی ہیں۔ اور کچھ خاص جانور ایسے ہیں جنھیں ذبح کرتے وقت وہ اللہ کا نام نہیں لیتے۔ (یہ لوگ یہ سب باتیں) خدا پر بہتان باندھنے کو کہتے اور کرتے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ ...... وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآءَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ ...... قُلْ اَمَرَ رَبِّيْ بِالْقِسْطِ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ...... قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ...... قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ

اے اولادِ آدم! شیطان تمھیں کسی فتنہ میں نہ مبتلا کر دے جس طرح کہ تمھارے والدین (آدم و حوا) کو اس نے جنت سے نکال باہر کرایا ...... اور جب یہ مشرکین کوئی بےحیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہو (اے نبی) کہ اللہ فحش کا حکم نہیں دیا کرتا ...... ان سے کہہ دو کہ میرے رب نے عدل اور انصاف کا حکم دیا ہے اور یہ کہ تم ہر سجدہ کے ادا کرتے وقت اپنا رخ (اسی کی طرف) سیدھا رکھا کرو ...... کہو (یعنی ان سے پوچھو) کہ اللہ کی پیدا کی ہوئی زینت (کپڑوں) کو، جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے پیدا کر رکھا ہے، اور کھانے پینے کی پاک

رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْیَ بِغَیْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِکُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطَانًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(الاعراف۔ ۳۔ ۴)

چیزوں کو کس نے حرام کر دیا ہے؟ .... انھیں بتا دو کہ میرے پروردگار نے تو فحش باتوں کو، ان میں سے جو ظاہر ہیں، انھیں بھی اور جو چھپی ڈھکی ہیں ان کو بھی ــ اور گناہ کے کام کو، ظلم کو، اللہ کے ساتھ ایسی چیز کو شریک کرنے کو جس کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی، اور اللہ تعالیٰ کے متعلق ایسی بات کہنے کو جس کا تمھیں کوئی علم نہ ہو، حرام ٹھیرا یا ہے۔

پھر ستم یہ کہ ان لوگوں نے اپنی من گھڑت بدعات کو "حقیقت" کا نام دے رکھا ہے، جس طرح اس قضائے الٰہی کو، جس کا انھیں مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے "حقیقت" کہا کرتے ہیں۔ اور اس "حقیقت" تک پہنچنے کا راستہ ان کے نزدیک وہ "سلوک" ہے جس کا "سالک" اور راہرو شارع کے امر و نہی کا پابند نہیں رہتا اس پر پابندی صرف اپنے مشاہدہ اور ذوق و وجدان کی ہوتی ہے۔ اور قدر سے استدلال کا دعویٰ دراصل ایک فریب ہے جس کو دوسروں کو خاموش کرنے کے لیے وہ استعمال کیا کرتے ہیں ورنہ اس امر میں ان کا مرجع خود ان کے نفس کی خواہشات اور ذہن کے تخیلات ہیں اور ہوا پرستی ان کے دین و مذہب کی اصل ہے۔ اس باب میں وہ ان بدعت پرست جہمیہ وغیرہ کلامیوں سے کسی طرح مختلف نہیں جو اپنے گھڑے ہوئے اور کتاب و سنت کے صریح مخالف اقوال کو "حقائق علیہ" قرار دیتے ہیں، جن پر سمعیات یعنی حقائق شرعیہ کو پس پشت ڈال کر وہ ایمان و اعتقاد رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔ رہ گئے کتاب اور سنت کے نصوص، سو یا تو وہ ان میں تحریف کرتے ہیں یا کھلم کھلا بالکلیہ ان سے اعراض برت جاتے ہیں، نہ انھیں سمجھتے ہیں نہ ہی ان پر غور و فکر کرتے ہیں بلکہ کہتے یہ ہیں کہ ہم ان کے معانی تک نہیں پہنچ سکتے اس لیے انھیں خدا کے حوالے کرنا چاہیے، حالانکہ پوری آزادی کے ساتھ ان نصوص شرعیہ کے خلاف معتقدات پر یقین رکھتے ہیں اور ایک موٹی عقل کا آدمی بھی انھیں مبادی اسلام کے خلاف دیکھ اور سمجھ سکتا ہے مگر یہ ہیں کہ قرآن و سنت کے محکمات تک کو علم الٰہی کے حوالے کر کے ہر طرح کی آزادی اور بے قیدی حاصل کیے ہوئے ہیں۔ پھر ان کے ان نام نہاد "حقائق عقلیہ" کی عقلیت کا حال یہ ہے کہ اگر انھیں صحیح علم و عقل کی روشنی میں دیکھا جائے تو سارے کا سارا مجموعہ جہل و خرافات ہی نظر آئے گا۔ بعینہٖ یہی حال ان "سالکین" کا ہے اگر ان کے ان مخالف شرع اقوال اور اوہام کی چھان بین کی جائے جن کو وہ اولیاء اللہ کے حقائق گمان کرتے ہیں، تو وہ سب کے سب ان کے اپنے جی کی بنائی ہوئی باتیں اور نفس کی خواہشیں ثابت ہوں گے جن کا اتباع خدا کے باغیوں اور دشمنوں کا کام ہے نہ کہ اس کے دوستوں کا۔

راہ حق سے منحرف ہو جانے کا سرچشمہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ انسان خدا کے نازل کیے ہوئے نصوص پر اپنے قیاس کو مقدم سمجھ لے اور امر الٰہی کو چھوڑ کر وہ اپنے نفس کا متبع بن جائے۔ کیونکہ ہر شخص کا ذوق اور وجدان اپنے مخصوص میلانات طبع کے مطابق ہوتا ہے۔ محبت اور میلان سے کوئی دل خالی نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جیسی اور جس قسم کی کسی شخص کے دل میں محبت ہوگی اسی کے مطابق اس کا مذاق اور وجدان بھی ہوگا۔ مثلاً اہل ایمان کا ایک خاص ذوق اور وجدان ہوگا جو دوسروں کے اندر نہیں پایا جا سکتا اور جس کی تصویر کچھ اس حدیث صحیح کے اندر دیکھی جا سکتی ہے جس میں رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ:-

"جس شخص کے اندر یہ تین چیزیں موجود ہوں گی وہ ایمان کی حلاوت سے بہرہ ور ہوگا، ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو ہر شے سے زیادہ محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ جس شخص کی بھی وہ محبت کرے، صرف اللہ ہی کے لیے کرے۔ تیسرے یہ کہ کفر سے نکل آنے کے بعد پھر اس میں دوبارہ لوٹ جانے کو اتنا ہی برا اور ناپسندیدہ سمجھے جتنا کہ وہ آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے۔"

دوسری حدیث میں ہے:-

"ایمان کا مزہ اسی نے چکھا جو اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا دین اور محمدؐ کو اپنا پیغمبر تسلیم کرنے پر راضی ہوا"

اسی طرح کافروں، بدعتیوں اور ہوا پرستوں میں سے ہر ایک کا، اس کی خواہشوں اور محبتوں کے مطابق، ایک خاص اور علٰحدہ وجدان ہوتا ہے۔ سفیان ابن عیینہؒ سے پوچھا گیا کہ یہ کیا بات ہے کہ وہ لوگ جن کا دین و ایمان صرف ان کی اہوا، اور خواہشات نفس ہوتی ہیں، وہ اپنی ان بے حقیقت اہوا، وآرا سے بھی شدید محبت رکھتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ کیا تمھیں اللہ تعالیٰ کا یہ قول یاد نہیں کہ وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِکُفْرِهِمْ (اور ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں پر بچھڑے کی محبت پیوست کر دی گئی)۔ یہی حال بت پرستوں کا ہے انھیں بھی اپنے بتوں سے اتنی ہی گہری محبت اور عقیدت ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا (الوہیت میں) دوسرے شریک ٹھیراتے ہیں جن سے اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ کی کی جاتی ہے، اور مومنوں کا حال یہ ہے کہ وہ سب سے زیادہ اللہ ہی سے

فَاِنْ لَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكَ فَاعْلَمْ اَنَّمَا يَتَّبِعُوْنَ اَهْوَاءَهُمْ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ

پس اگر یہ لوگ تمھارا جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ صرف اپنے نفس کی خواہشوں کے پیرو کار ہیں، اور اس شخص سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کی نازل کی ہوئی کسی ہدایت کے بغیر اپنی خواہش نفس کی پیروی کرے؟

اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى۔

یہ لوگ صرف اپنے گمان اور اپنی خواہشات نفس کا اتباع کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے رب کے پاس سے ان کے یہاں ہدایت آچکی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ ہر شخص کا وجدان اور میلان طبع، اس کے مخصوص اعتقاد کے زیر اثر ہوتا ہے اور مجرد وجدان انسانی کو حقایق کی طرف رہنمائی کا حق نہیں دیا جاسکتا۔ لیکن ان نام نہاد اہل سلوک کا جن کے طرز استدلال سے ہم اس وقت بحث کر رہے ہیں، یہی حال ہے۔ انکے اعتقادات اور اعمال کا قبلہ نما خود ان کا اپنا ذوق اور ہوائے نفس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ عموماً راگ باجے کے بڑے شیدا ہوا کرتے ہیں اور اس راگ اور باجے کا اثر نفس انسانی پر یہ ہوتا ہے کہ وہ صرف محبت مطلقہ کے جذبات کو ابھار دیتا ہے، وہ محبت مطلقہ جو صرف اہل ایمان ہی کے اندر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں خدا پرست، بت پرست، نسل پرست، وطن پرست، قوم پرست، زن پرست اور امرد پرست سبھی برابر کے شریک ہیں کیونکہ محبت سے تو کوئی دل خالی نہیں، اس لیے جس کے دل میں جو محبت ہوگی نغموں کی گرمی اسی محبت کے شعلوں کو تیز تر کر دے گی، یہ ضروری نہیں کہ صرف محبت ایمان ہی کو گرما دیا کرے اور دوسری محبتوں کو نہ اکسائے۔

یہ لوگ اپنے وجدان اور مذاق کے ایسے گہرے عقیدت کیش اور پختہ کار متبع ہوتے ہیں کہ قرآن وسنت کی ہدایات کو ان کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں دیتے، اور ظاہر ہے کہ جس عبادت الٰہی کی تبلیغ کی خاطر خدا کے پیامبر دنیا میں آئے تھے اور جس طاعت خداوندی کی تذکیر انبیا کرام کی بعثت کا مقصد وحید تھا، اس کا مخالف دین الٰہی کا پیرو کس طرح ہو سکتا ہے، وہ پیرو تو دراصل اپنے ہوائے نفس کا ہوا۔

(۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اس طائفہ میں سب سے زیادہ قدر و منزلت کے مالک ہیں۔ یہ لوگ مشہور فرائض دینی کے بجا لانے اور عام محرمات سے دور رہنے میں تو احکام الٰہی کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں، لیکن غلطی یہ کرتے ہیں کہ اس عالم اسباب میں رہتے ہوئے اسباب کی طرف توجہ نہیں کرتے اور انھیں چھوڑ دیتے ہیں حالانکہ یہ اسباب بھی دراصل عبادت ہی ہیں۔ ان کے اس طرز عمل کی بنیاد ان کا یہ گمان ہے کہ جب کوئی عارف کامل قدر کا مشاہدہ کر لیتا ہے تو پھر اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اسے جد وجہد کی چنداں حاجت نہیں رہتی۔ چنانچہ ان لوگوں میں بعضوں نے صاف

صاف اس امر کی تصریح کر دی ہے کہ توکل (یعنی کسی امر میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر کے انجام کار کو خدا کے سپرد کر دینا) اور دعا اور اسی طرح کے دوسرے اوصاف ایمانی خواص کے مقامات نہیں، بلکہ یہ تو عوام کے مقامات ہیں، کیونکہ جو شخص قدر الٰہی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا اس کو تو یہ معلوم ہی ہو گیا کہ فلاں چیز صحیفۂ تقدیر میں لکھی ہوئی ہے اور وہ اپنے وقت پر ظہور میں آکر رہے گی، پھر اس کے لیے سعی جہد کی ضرورت ہی کیا؟ لیکن یہ ایک عظیم الشان غلطی ہے، کیونکہ اللہ تعالےٰ نے اشیاء کو ان کے اسباب کے ماتحت مقدر فرمایا ہے جس طرح کہ سعادت اور شقاوت اپنے اسباب کے ساتھ مقدر کی گئی ہیں جیسا کہ مخبر صادقؐ نے ہمیں بتایا ہے:۔

"اللہ تعالیٰ نے کچھ لوگوں کو جنت کے لیے پیدا کیا ہے اور ان کے لیے اس وقت، جبکہ وہ ابھی پشت پدر ہی میں تھے جنت کو پیدا کیا اور وہ اہل جنت کا سا کام کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگوں کی تخلیق دوزخ کے لیے ہوئی ہے اور دوزخ ان کے لیے اس وقت خلق کی گئی جب کہ وہ پشت آباہی میں تھے اور وہ اہل دوزخ جیسا عمل کرتے ہیں۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ صلعم نے صحابہ کرام کو یہ حقیقت سنائی کہ اللہ تعالیٰ نے ہر شے کی تقدیر لکھ رکھی ہے تو انھوں نے کہا کہ یا رسول اللہ تو کیوں نہ ہم عمل کرنا چھوڑ دیں اور نوشتہ الٰہی پر بھروسہ کر کے بیٹھ رہیں؟ ہادی علیہ السلام نے جواب دیا:۔

"نہیں ایسا نہ کرو، بلکہ عمل کرو، کیونکہ ہر شخص کے لیے اس کام کی راہ آسان کر دی جاتی ہے جو اس کے لیے مقدر ہو چکا ہوتا ہے۔ جو سعید ہے اس کے لیے ایک سعید جیسے اعمال کی۔ اور جو شقی ہے، اس کے لیے اشقیا جیسے کاموں کی راہ ہموار کر دی جاتی ہے۔"

پس اللہ تعالیٰ نے جن اسباب و ذرائع کے اختیار کرنے کی اپنے بندوں کو ہدایت فرمائی ہے۔ وہ خود بھی عبادت کی حیثیت رکھتے ہیں اور توکل کا سررشتہ تو عبادت سے پوری طرح ملا ہوا ہے۔ ذیل کی آیات قرآنی کے الفاظ اور اسلوب بیان پر غور کرو:۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ — پس اس کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔

قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ — کہہ، وہ میرا پروردگار ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور اسی کے حضور مجھے لوٹ کر جانا ہے۔

(۴) چوتھی قسم ان لوگوں کی ہے جو واجبات دینی کو تو ادا کرتے ہیں مگر مستحبات اور نوافل کا کوئی اہتمام نہیں کرتے، سو اسی حساب سے ان کے درجات میں کمی اور پستی آجاتی ہے۔

(۵) پانچویں قسم ان لوگوں کی ہے جو کشف و کرامت اور خرق عادت کی باطنی قوت پیدا کر لینے کی وجہ سے فریب نفس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور عبادات کی ادائگی سے بے پروائی اور شکر خداوندی کی بجا آوری سے بے نیازی اختیار کر لیتے ہیں۔

ان گمراہیوں کا علاج یہ سب گمراہیاں، جن کا اوپر ذکر ہوا، اور اسی طرح کی بے شمار لغزشیں اہل سلوک و توجہ کو راہ سلوک میں اکثر پیش آیا کرتی ہیں اور ان سے محفوظ رہنے کی صرف ایک ہی سبیل ہے، اور وہ یہ کہ بندہ، ہر لحظہ و ہر آن، ان احکام الٰہی کی سختی کے ساتھ پابندی کرے جنھیں دے کر اس نے اپنے رسول کو دنیا میں مبعوث فرمایا ہے۔ امام زہری نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا جب انھوں نے فرمایا کہ "ہمارے اسلاف کہا کرتے تھے کہ سنت کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رہنے میں نجات ہے" اور یہ ایک لازوال اور بے ریب حقیقت ہے کیونکہ سنت کی مثال بقول امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، کشتی نوح کی سی ہے، جو اس میں جا بیٹھا اس نے نجات پائی اور جو اس سے علٰحدہ رہا، وہ غرق ہوا۔ اور یہ جو نصوص کتاب و سنت میں "عبادت" "طاعت" "استقامت" اور "لزوم صراط مستقیم" وغیرہ الفاظ آتے ہیں تو ان میں صرف

نام اور لفظ کا تعدد ہے، مسمّٰی اور مفہوم سب کا ایک ہی ہے، اور اس مفہوم و مقصود کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ بندہ صرف اللہ ہی کی بندگی کرے دوسری یہ کہ یہ بندگی بھی اسی کے نازل کیے ہوئے اور بتائے ہوئے طریقہ پر کرے، نہ کہ اپنے من مانے طریقوں اور اپنے جی کے گھڑے ہوئے راستوں پر۔ قرآن کی ان آیتوں میں بھی یہی رازِ ہدایت مستور ہے:۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا

پس جو کوئی اپنے پروردگار کے روبرو ہونے کا کھٹکا رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ "صالح عمل" کرے اور اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ کرے۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ الخ

ہاں جس نے اللہ کے لیے اپنی پیشانی جھکائی اور "احسان" کی روش اختیار کرتے ہوئے جھکائی اس کے لیے اس کے رب کے پاس اجر ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا الخ

اس شخص کے دین وطریق طاعت سے کس کا دین وطریق طاعت بہتر ہوگا جس نے اللہ کے لیے اپنی گردن ڈال دی درانحالیکہ وہ "احسان" کرنے والا ہو اور جس نے یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کی؟

تینوں آیتوں کو ایک دوسرے کی روشنی میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ پہلی آیت میں جس شے کو عمل صالح کہا گیا ہے، دوسری اور تیسری میں اسی کو "احسان" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی عمل صالح ہی کا دوسرا نام احسان ہے، اور احسان کے معنی ہیں "حسنات" کی بجاآوری۔ اور حسنات ان چیزوں کو کہتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہوں، اور اللہ و رسول کی پسندیدہ چیزیں وہی ہیں جن کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے۔ پس وہ بدعات جن کی دین میں کوئی اصل وسند نہیں، اللہ اور رسول کو محبوب نہیں ہوسکتیں، اور جب وہ اللہ و رسول کو محبوب نہیں تو لازماً حسنات اور اعمال صالحہ میں سے بھی نہیں ہوسکتیں، بالکل ان فواحش و منکرات کی طرح جن کا فسق و فجور ہونا بدیہی ہے۔

وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا اور اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ کے ٹکڑوں میں اخلاص دین کی ہدایت فرمائی گئی ہے، یعنی خدا کی طاعت اس یکسوئی، بے آمیزی اور خلوص باطن کے ساتھ کی جانی چاہیے کہ اس کے کسی گوشہ میں ماسوا کا دھندلا سا بھی وہم نہ گذرنے پائے۔ حضرت عمرؓ دعا مانگا کرتے تھے کہ:۔

"خدایا! میرے ہر عمل کو صالح اور اپنے ہی لیے خالص کر اور اس میں کسی کا کچھ بھی حصہ نہ بنا"۔

فضیل ابن عیاضؒ نے آیت لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا کہ "احسن" کے معنی ہیں "اخلص" اور "اصوب"۔ پوچھا گیا "اخلص" اور "اصوب" کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا "عمل اگر خالص ہو لیکن صواب نہ ہو تو وہ عنداللہ مقبول نہیں، اسی طرح اگر صواب تو ہو مگر خالص نہ ہو تو بھی مقبول نہیں۔ بارگاہ الٰہی میں وہی عمل لائق پذیرائی ہے جو خالص بھی ہو اور صواب بھی۔ "خالص" کا مطلب یہ ہے کہ خدا ہی کے لیے ہو، اور صواب کا مدعا یہ ہے کہ سنت رسول کے مطابق ہو"۔

ایک اعتراض اور اس کا جواب

اب یہ اعتراض ہوسکتا ہے کہ اگر وہ تمام اعمال وصفات انسانی جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب ہیں حدود عبادت میں شامل ہیں تو پھر ایسا کیوں ہے کہ قرآن مجید میں بارہا لفظ عبادت پر دوسرے اعمال صالحہ یا صفات حسنہ کو عطف کیا گیا ہے حالانکہ عطف دلیل مغایرت ہے؟ مثال کے لیے چند آیتیں ملاحظہ ہوں:۔

- اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (فاتحہ)

خدایا ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔

فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ — پس اسی کی عبادت کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ — اللہ کی عبادت کرو، اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

پہلی آیت میں لفظ عبادت پر استعانت کو، دوسری میں توکل کو اور تیسری میں تقوی اور اطاعت رسول کو عطف کیا گیا ہے۔

لیکن یہ اعتراض اس غلط مفروضہ پر مبنی ہے کہ عطف ہمیشہ مغایرت کی دلیل ہوتا ہے، خود قرآن ہی کے اندر بے شمار جملے ایسے موجود ہیں جو اس مفروضہ کی تغلیط کرتے ہیں:۔

مثلاً اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ میں فحشاء پر منکر کا لفظ معطوف کیا گیا ہے حالانکہ فحشاء منکر میں داخل اور اس کا ایک جزو ہے، نہ کہ اس سے کوئی علیحدہ شے۔ دوسری آیت میں فرمایا جاتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۗئِ ذِي الْقُرْبٰى الخ یہاں ایتاء ذی القربی کو عدل و احسان پر عطف گردانا گیا ہے، حالانکہ قرابت داروں کی مالی اعانت عدل و احسان ہی کی ایک صورت ہے۔ تیسری جگہ ہے وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ۔ یہاں اقامت صلوٰۃ کو تمسک بالکتاب پر عطف کیا گیا ہے۔ اور یہ معلوم ہے کہ اقامت صلوٰۃ تمسک بالکتاب ہی کی ایک شکل بلکہ اس کا عظیم ترین مظہر ہے۔

ان شواہد سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عطف ہمیشہ مغایرت ہی پر دلالت نہیں کرتا بلکہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً کبھی ایک لفظ دوسرے کا جزء ہوتا ہے لیکن اس پر عطف کر دیا جاتا ہے اور مقصد اس عطف کا لفظ ثانی کی خصوصیت ذکر کا اظہار ہوتا ہے۔ اور کبھی ایک لفظ ایسا ہوتا ہے کہ مختلف مواقع بیان کے لحاظ سے مختلف معانی رکھتا ہے، اگر وہ تنہا لایا جائے تو اس کے مفہوم میں وسعت اور عمومیت ہوتی ہے، اور اگر کسی دوسرے لفظ کے ساتھ اس کا ذکر ہو تو اپنے مفہوم میں محدود اور خاص ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فقیر اور مسکین کے الفاظ کو لو، یہی لفظ فقیر ہے جو آیت لِلْفُقَرَاۗءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ میں تنہا آیا ہے، نیز یہی لفظ مسکین ہے جو آیت اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ میں تنہا استعمال ہونے کے باعث فقیر کے مفہوم پر بھی حاوی ہے۔ لیکن یہی دونوں الفاظ جب آیت اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاۗءِ وَالْمَسٰكِيْنِ میں ایک ساتھ آ گئے تو دونوں کے الگ الگ مفہوم ہو گئے اور دونوں کی علیحدہ علیحدہ قسمیں ہو گئیں۔

اس طرز بیان، یعنی ایک اسم عام پر اس کے کسی جزو خاص کو عطف کر دینے میں مختلف مواقع پر بلاغت کے مختلف رموز مدنظر ہوتے ہیں۔ کہیں تو اس اسم خاص کی کسی ایسی خاصیت اور شان کو نمایاں کرنا مقصود ہوتا ہے جو اسم عام کے بقیہ افراد میں موجود نہیں ہوتی۔ اور کہیں لفظ عام پر اطلاق اور اجمال کا پردہ پڑا ہوتا ہے جس کے نیچے اس کی عمومیت چھپ جاتی ہے اور اندیشہ ہوتا ہے کہ مبادا لفظ عام کے کچھ افراد سامع کے ذہن میں آنے سے رہ جائیں اس لیے اس کے بعد اسم خاص کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

اس اسلوب بیان اور اصول بلاغت کی مثالیں قرآن میں کثرت سے ملتی ہیں، چند آیتیں ہم اوپر بیان کر آئے ہیں بعض مثالیں ذرا کسی قدر توضیح کے ساتھ اور پیش کی جاتی ہیں:۔

اُتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ — قرآن میں سے جو کچھ تمہارے اوپر وحی کیا گیا ہے اس کی "تلاوت" کرو اور نماز قائم کرو۔

"تلاوت کرو" کا مطلب محض زبان سے الفاظ کی ادائگی نہیں بلکہ اس کے احکام کا اتباع ہے، جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے آیت اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ "جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے، وہ اس کی اس طرح تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے یعنی اس کے حرام ٹھیرائے ہوئے کو حرام قرار دیتے اور اس کے حلال کو حلال سمجھتے ہیں، اس کی غیر واضح اور متشابہ آیتوں پر ایمان لاتے

اور محکم آیتوں پر اپنے اعمال کی بنیاد رکھتے ہیں“۔ تلاوتِ کتاب یعنی اتباعِ کتاب، نماز اور نماز کی طرح تمام احکام و شرائع پر محیط ہے، لیکن آیت زیرِ بحث میں تلاوتِ کتاب پر اقامتِ صلوٰۃ کو عطف کر کے اس کو مخصوص اہتمام کے ساتھ ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ اس کی اہمیت اور علوِ شان کی طرف نگاہیں اٹھ جائیں۔

(۲) اِتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا — اللہ سے ڈرو اور ٹھیک بات کرو

(۳) اِتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ — اللہ سے ڈرو اور اس کے (تقرب و رضا) کے لیے ذریعہ مہیا کرو۔

دیکھو ان دونوں آیتوں میں تقویٰ پر قولِ سدید اور ابتغاءِ وسیلہ کو عطف کیا گیا ہے، حالانکہ یہ چیزیں بجائے خود تقویٰ کی مکملات میں سے ہیں اور اس کی شاخ اور فرع۔ لیکن انھیں فوائد کے پیشِ نظر ان کا خصوصی تذکرہ کر دیا گیا ہے جن کی تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں۔

ان تفصیلات اور ان اصولِ معانی و بلاغت کی روشنی میں ان آیتوں کے الفاظ پر نگاہ ڈالو جن کو بطور امثلہ اعتراض پیش کیا گیا ہے۔ ان میں ”عبادت“ کے لفظ پر توکل، استعانت اور تقویٰ کے الفاظ کو معطوف کر کے لایا گیا ہے، سو اس عطف کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ چیزیں عبادت کے دائرہ سے باہر ہیں بلکہ یہ ہے کہ یہ چیزیں عبادت کے اجزاء تو ہیں لیکن عبادت کے لفظِ عام کے بعد ان کا خصوصی ذکر کر دیا گیا ہے تاکہ عابد کی نگاہ میں ان مخصوص اجزائے عبادت کی شانِ امتیاز جلوہ گر رہے اور وہ ان صفاتِ ایمانی کو ہمیشہ اپنی زندگی کے ایک ایک گوشہ میں جاری و ساری رکھے، کیونکہ یہ چیزیں بقیہ ساری انواعِ عبادت کی صحیح صحیح بجا آوری میں بنیادی اہمیت رکھتی ہیں اور کوئی عبادت ان کی مدد کے بغیر ادا نہیں ہو سکتی۔

مخلوق کا معیارِ کمال اس پوری تقریر سے یہ حقیقت اب بالکل بے نقاب ہو جانی چاہیے کہ کسی انسانی یا غیر انسانی مخلوق کا کمالِ بزرگی اسی عبودیت میں پوشیدہ ہے۔ جس بندہ کی عبودیت جتنی ہی زیادہ بلند ہو گی اس کا درجہ اتنا ہی زیادہ اونچا اور قابلِ رشک ہو گا۔ اور جو شخص یہ گمان رکھتا ہے کہ مخلوق کے لیے عبودیت کی منزل سے آگے نکل جانا ممکن ہے یا کسی مخلوق کا کمال، عبودیت سے ماوراء ہو جانے میں ہے، وہ جہل و گمراہی کے اس مقام پر ہے جس کے آگے جہالت کی کوئی اور منزل باقی نہیں رہ جاتی۔ اس بحث کے آغاز میں متعدد آیات پیش کر کے ہم یہ بتا چکے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی مقرب ترین مخلوقات کا مداحانہ ذکر کرنا چاہتا ہے تو انھیں ”عبد“ کا خطاب دیتا ہے اور عبادت ہی کو ان کی صفتِ امتیاز اور وجہ افتخار قرار دیتا ہے۔ اور جب کسی مخلوق کی مذمت کرنی ہوتی ہے تو اس پر یہی فردِ جرم لگاتا ہے کہ اس نے اپنی عبدیت کا حق ادا نہیں کیا اور میری عبادت سے روگرداں رہا۔ نیز ایک سے زائد نصوصِ قرآنی کے ذریعہ سے اس امر کو بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے پیغمبر بھی دنیا میں بھیجے انھیں اسی پیغامِ عبادت کے ساتھ بھیجا اور ہر پیغمبر نے اپنی دعوت کی ابتدا اُعْبُدُوا اللّٰهَ کے الفاظ سے کی۔

(باقی)

زیرِ طبع مطبوعات

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں۔ What is Islam?

تفہیمات۔ (رسالہ دینیات کا انگریزی ترجمہ چھپ کر تیار ہو چکا ہے۔ چند روز میں مل سکیگا)

لاہور میں ہماری مطبوعات ملنے کا پتہ۔

”مکتبۂ اسلامی“۔ ۴۳۔ رہانی روڈ۔ پرانی انارکلی لاہور۔